(غلام گردش)

بڑھاپے کا برزخ

جی او آر ٹو، یعنی بہاولپور ہاؤس سے اس مضافاتی کالونی میں منتقل ہوئے کو تقریباً ایک سال ہو چکا ہے۔ چند مہینوں سے عبید کامران، روز شام کو آ جاتا ہے۔ دونوں اکٹھے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پیدل چلتے ہیں۔ عبید، کیڈٹ کالج کے زمانے کا کلاس فیلو ہے۔ یعنی پچھلی صدی سے۔ چھ فٹ کا وجیہہ انسان۔ پوری عمر بھرپور ورزش کرتا رہا ہے۔ واک کرتے ہوئے ہم کالج کے زمانے کی باتیں کرتے ہیں۔ بے مقصد موضوعات پر بحث کرتے ہیں۔ اگلے دن، تقریباً دوبارہ انہی موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں۔ ساٹھ ستر منٹ گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ عبید اور میں، بلکہ میرے تمام دوست ساٹھ سال سے اوپر کے ہو چکے ہیں۔ دل تو نہیں چاہتا کہ لکھوں، مگر حقیقت میں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لگتا ہے، چھ دہائیاں، پر لگا کر گزر گئیں اور اس وقت ہاتھوں میں صرف اور صرف گزرے ہوئے وقت کی گرد ہے۔ مگر ساٹھ سال سے اوپر کے دس مہینوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ اتنا کچھ کہ ماضی کی زندگی میں وہ سب کچھ سیکھ نہ پایا۔ شعور کی ایک نئی منزل طے کی ہے۔ پختگی سے مزید پختگی کا سفر۔ یا شائد ناپختگی کا۔ بہرحال چند حیرت انگیز نکات سامنے آئے ہیں۔ جنکا ادراک کم از کم پہلے بالکل نہیں تھا۔ ان میں سے ایک یکساں اہم عنصر سامنے آیا ہے۔ ساٹھ برس کے اوپر کے مرد اور خواتین، اگر کوئی کام نہیں کر رہے، تو ایک بھرپور تنہائی کا شکار ہیں۔ انکے پاس وقت ہی وقت ہے۔ صبح سے شام تک اور پھر رات تک۔ اکثریت گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ مگر انکی بات سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اولاد، اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتی ہے۔ متعدد لوگوں کے بچے اور بچیاں، ملک سے باہر منتقل ہو جاتے ہیں۔ انہیں قطعاً خیال نہیں ہوتا کہ پاکستان میں بڑے بڑے گھروں میں انکے بزرگ قیدِ تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک ایسی اسیری جس میں انکے پاس شائد سب کچھ ہے، مگر کچھ بھی نہیں ہے۔ گاڑی ہے، مگر کوئی ایسی جگہ نہیں، جہاں وہ جائیں اور اپنی مرضی سے وقت گزار سکیں۔ قہقہے لگا سکیں۔ بے تکلفی سے وقت کو دھکا دے سکیں۔ انکے لیے، گھر، گاڑی، سب کچھ اُدھورا سا ہے۔ ویسے اب احساس ہوتا ہے کہ ہر انسان کی زندگی اُدھوری سی ہوتی ہے۔ اس خلا میں سب سے خوفناک پہلو تنہائی ہی کا ہے۔

دو ماہ پہلے، عبید اور میں، شام کو واک کر رہے تھے۔ دیکھا تو ایک گھر کے سامنے، کافی بزرگ آدمی، پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں لاٹھی اور بڑی بے بسی سے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں، اسکے پاس کھڑے ہو گئے اور کسی تعارف کے بغیر گفتگو کرنی شروع کر دی۔ بزرگ شخص نے بتایا کہ اسکے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ تمام کے تمام، کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں۔ لاہور میں اکیلا رہتا ہے۔ اس شخص نے اپنا نام بھی بتایا مگر میں بھول چکا ہوں۔ صرف دو تین منٹ میں اس نے چاہت سے بولنا شروع کر دیا۔ ایسے لگتا تھا کہ بہت عرصے سے کوئی بھی اسکی باتیں سننے والا نہیں ہے۔ کہا کہ ہمارے ساتھ تھوڑا سا پیدل چلیں۔ کہنے لگا، مجھے اتنی بیماریاں ہیں کہ بڑے عرصے سے چل نہیں پایا۔ ہرگز ہرگز نہیں چل سکتا۔ اگر کرسی سے اُٹھونگا تو گر کر چوٹ لگ سکتی ہے۔ ذہن میں عجیب سا خیال آیا۔ گزارش کی، کہ ہم دونوں، اسکے اردگرد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جہاں کمزوری محسوس کریں، ہمارا سہارا لے لیں۔ ہاں، انکا نام ملک سے شروع ہوتا تھا۔ ملک صاحب کہنے لگے کہ نہیں چل سکتے۔ میرے اصرار پر، کرسی سے اُٹھے اور لاٹھی کے سہارے دس پندرہ قدم لیے۔ دوبارہ

گزارش کی، کہ لاٹھی چھوڑ کر دکھائیں۔سن کر ملک صاحب کہنے لگے۔ناممکن۔لاٹھی کے بغیر تو پیدل چلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔جب انہیں سہارا دینے کیلئے ساتھ کھڑے ہوئے تو اس شخص نے لاٹھی چھوڑ دی اور آہستہ آہستہ پیدل چلنا شروع کر دیا۔کمال دیکھیے کہ بزرگ شخص کسی سہارے کے بغیر آرام سے چل رہا تھا۔دس منٹ بعد اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔کہنے لگا کہ مجھے تو کئی سالوں سے کوئی کہنے والا نہیں ہے کہ پیدل چلو، ہم تمہارا سہارا بنیں گے اور گرنے نہیں دینگے۔ملک صاحب، زار و قطار رو رہے تھے۔یہ وہ یکسانیت اور تنہائی ہے۔جسکا تمام بابے شکار ہیں۔اسکو تسلیم کرنا اور اس عذاب سے بچنا از حد ضروری ہے۔بلکہ یہ زندگی، نیم زندگی اور موت کے درمیان اصل فرق ہے۔

اس عذاب کو میں ذاتی زندگی میں دس بارہ سال پہلے محسوس کر چکا ہوں۔میری والدہ نے 1956 میں علی گڑھ سے بوٹنی (Botany) میں ایم ایس ای کی تھی۔پاکستان آئیں تو شعبہ تعلیم سے منسلک ہوئیں۔لیکچرار سے پرنسپل تک کا تعلیمی سفر طے کیا، جو بذاتِ خود کمال تھا۔ریٹائرمنٹ کے بعد، لائل پور ہی میں والد کے نام پر ایک سکول کھول لیا اور پھر دوبارہ اپنے شعبہ یعنی تعلیم و تدریس میں مصروف ہو گئیں۔انکی عادت تھی کہ اپنے ذاتی گھر کے علاوہ کسی بیٹے یا بیٹی کے گھر نہیں رہتی تھیں۔نائلہ، میری چھوٹی بہن کے گھر بہت کم جاتی تھیں۔میرے گھر بھی بہت کم قیام کرتی تھیں۔ایک دن، چھوٹے بھائی، مبشر کا فون آیا کہ والدہ کو فالج ہو گیا ہے۔اس ایک جملے نے میری زندگی تبدیل کر دی۔لگا کہ صدیوں کا بوڑھا ہوں۔لائل پور سے والدہ کو لاہور لیکر آیا۔جسم کا ایک بازو اور ایک ٹانگ کام کرنا چھوڑ چکی تھی۔ایک ایسی خاتون، جو ہر وقت مصروف رہتی تھیں، اسکے لیے، معذوری کیا گی۔یہ سوچ کر بھی خوف آتا ہے۔والدہ کو فالج ہونے کے بعد ایک فیصلہ کیا اور انہیں اپنے ساتھ رکھونگا۔پھر جس ضلع میں بھی پوسٹنگ ہوئی، والدہ میرے ساتھ رہیں۔بتدریج ایک بہت مشکل چیز محسوس کی۔کہ فالج نے انہیں حد درجہ غمگین کر دیا ہے۔بتاتا چلوں کہ میرے والد بیس سال پہلے انتقال کر چکے تھے۔والدہ کے کمرے میں ٹی وی موجود تھا۔مگر بہت کم دیکھتی تھیں۔ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے جانتا تھا کہ اس مرض سے بہتری ممکن نہیں ہے۔اب میری والدہ پوری زندگی چل نہیں پائینگیں۔میں نے اسکا خود ہی ایک علاج نکال لیا۔آفس جانے سے پہلے، والدہ کے ساتھ بیٹھ کر خوب گپیں لگانے کی کوشش کرتا تھا۔واپس آ کر، کافی دیر تک انہیں کہتا تھا کہ آپ اس ہفتہ بالکل ٹھیک ہو جائینگی۔پھر ہم دونوں، باہر لان میں خوب دوڑ لگایا کرینگے۔والدہ، یہ سنکر خوب ہنستی تھیں۔جواب دیتی تھیں کہ تم درست کہہ رہے ہو۔میں اب بہت جلدی ٹھیک ہو جاؤنگی۔پھر باہر بچوں کے ساتھ دوڑ لگاؤں گی۔انہوں نے ذہنی طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔بس ایک دو ہفتوں میں صحت یاب ہو جائینگی۔کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں۔میرے ایک جھوٹ نے انکی زندگی بہتر کرنی شروع کر دی۔غم کی شدت اور حدت، دونوں کافی حد تک کم ہو گئیں۔اس طرح کے جملے میں اکثر کہتا رہتا تھا۔میرے دونوں بیٹے، سکول سے واپس آ کر سیدھے والدہ کے کمرے میں جا کر بیٹھے رہتے تھے۔میری اہلیہ، بھابھی اور چھوٹی بہن بھی یہی کرتی تھیں۔خدا، انہیں اس نیکی کا اَجر دے۔ہم سب نے والدہ کو یقین دلا دیا تھا کہ فالج کی بیماری سے جلد صحت یاب ہو جائینگی۔اسکے بعد انکی معمول کی زندگی شروع ہو جائیگی۔بحیثیت ڈاکٹر اندازہ تھا کہ جھوٹ بول رہا ہوں۔مگر معصومانہ دروغ گوئی نے والدہ پر بے حد مثبت اثر ڈالا۔آگے لکھنے کی استطاعت نہیں ہے۔ہم تمام نے ملکر والدہ کی تنہائی کا کافی حد تک علاج کر لیا تھا۔باقی موت برحق ہے۔آج بھی اور کل بھی، ہم سب نے موت کے قافلے میں شامل تو ہونا ہے۔اس حقیقت

کو جاننا اور یاد رکھنا حد درجہ ضروری ہے۔

عرض کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر گھر میں بزرگ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ والد، والدہ، ساس، سسر یا کسی بھی اور رشتے کی تسبیح میں پروئے ہوئے یہ جھریوں والے چہرے، ہر خاندان میں موجود ہیں۔ یہ تمام لوگ، برزخ میں رہ رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور ان سے بھی معمولی باتوں پر خوش ہو جاتے ہیں۔ اکثریت یہ بھی بھول جاتی ہے کہ انہوں نے دوائی کھائی ہے یا نہیں۔ ماضی بعید کی تمام باتیں یاد ہوتی ہیں۔ مگر ماضی قریب کی تمام باتیں فراموش کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی بیماری ہے جو انہیں معذور کر چکی ہے، تو بے بسی اور محتاجی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ میری نظر میں، بڑھاپا، ہرگز ہرگز عذاب نہیں ہے۔ اہم نکتہ صرف ایک ہے کہ بوڑھے انسان کے اردگرد کے لوگ اسکے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ لکھتے لکھتے ایک بہت پرانی بات یاد آ گئی۔ میرے والد کے ایک دوست تھے جو لارنس روڈ لاہور پر رہتے تھے۔ نام کے ساتھ نواب لگتا تھا۔ اور حقیقت میں نوابی شان سے زندگی گزار رہے تھے۔ دوا یکڑ کا گھر تھا۔ ایک دن، والد صاحب نے پیغام بھجوایا کہ لاہور آیا ہوا ہوں، تم نواب صاحب کے گھر میں آ جاؤ۔ پہنچا، تو گھر کی خوبصورتی دیکھ کر اَز حد خوشی ہوئی۔ گھر کے شروع میں ایک ڈیوڑھی سی تھی۔ اس میں ایک بہت ضعیف آدمی پلنگ پر لیٹا بری طرح کھانس رہا تھا۔ خیر اندر گیا، تو شاندار ڈرائنگ روم میں نواب صاحب موجود تھے۔ گپیں لگ رہی تھیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد، والد صاحب سے اجازت لیکر گھر سے واپس نکلا۔ ویسے ہی نوکر سے پوچھا کہ ڈیوڑھی میں یہ بوڑھا شخص کون ہے اور اسے کھانسی کی دوائی کیوں نہیں دی جا رہی۔ نوکر کا جواب تھا کہ یہ بڑے نواب صاحب ہیں۔ انہیں دمہ کی بیماری ہے۔ بیگم صاحبہ اور چھوٹے نواب صاحب نے انہیں گھر سے نکال کر ڈیوڑھی میں منتقل کر دیا ہے۔ کوئی بھی گھر والا انکے پاس نہیں جاتا۔ ایسے لگا کہ مجھے کسی نے دکھ کے سمندر میں دھکا دیدیا ہے۔ مگر یہ سچ تھا اور آج بھی سچ ہے۔ کئی لوگ، بوڑھے بزرگوں کو بے اعتنائی کی دلدل میں پھینک دیتے ہیں۔ ان سے عملی لاتعلقی کر لیتے ہیں۔ صرف اور صرف دکھاوے کے چند جملے بول کر اپنا فرض پورا کر لیتے تھے۔ نہیں سوچتے کہ بڑھاپا تو ان پر بھی آئیگا اور ضرور آئیگا۔ مجھے تو ایسے لوگ پسند ہیں جو اپنے بزرگوں سے خوب جھوٹ بول کر انہیں خوش رکھتے ہیں۔ انہیں بتاتے ہیں کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائینگے۔ بس ایک دو ہفتہ کی بات ہے۔ یہ دروغ گو دراصل شاندار انسان ہیں جو بزرگوں کو بوجھ نہیں سمجھتے۔ انہیں تنہا نہیں رہنے دیتے۔ انہیں ہنساتے ہیں اور انکی برزخ آسان کر دیتے ہیں!

راؤ منظر حیات